



ایسا کہاں سے لاؤں کہ تجھ سا کہیں جسے

تحریر۔ پروفیسر غلام سرور قریشی

موضوع۔ ”ایسا کہاں سے لاؤں کہ تجھ سا کہیں جسے“

تحریر۔ پروفیسر غلام سرور قریشی

حضرت خواجہ سید محمد وجیہ السیما عرفانی قدس اللہ تعالیٰ سرہ العزیز سلسلہ چشتیہ کے منفرد اور مایہ ناز شیخ طریقت ہی نہیں ایک باعمل عالم، مفسر قرآن، شارح دین بلکہ ایک وقت کے بہترین صحافی، مترجم، مختلف زبانوں پر عبور رکھنے والے شاعر، نثر نگار، ماہر اقبالیات، علوم ظاہری و باطنی کے شناور، دانش و حکمت سے مزین وہ آفتاب ہیں کہ جن کی مثال ماضی قریب میں نہیں ملتی۔ حضرت بابا عرفانی کے نام سے لوگ زیادہ جانتے ہیں، صحافت میں ڈبلیو ایس عرفانی کے نام سے تحریریں موجود ہیں اور ریڈیو ٹی وی سے بے شمار پروگراموں کے خالق بھی ہیں۔ حضرت بابا عرفانی کے بارے میں مختصر تحریر میں کچھ عرض کرنا ممکن نہیں۔

نامعلوم میری جستجوئے شوق کہاں کہاں لئے پھری اور میں کشکول لئے کس کس درخیر گیا۔ اپریل 1970ء کی روشن صبح نمودار ہوئی، میں ان دنوں ایک الجھن میں گرفتار تھا اور بہت پریشان تھا۔ میرے دوست ملک رحمت علی مجھ کو شملہ پہاڑی کے تیب ایک جگہ لے گئے جہاں ایک ورکشاپ کے نیچے ایک ہوٹل سا تھا اس کے پہلو میں کچھ لوگ بچوں پر بیٹھے تھے ان کے درمیان ایک پیارے سے سادہ سے پروقار بزرگ نمایاں تھے وہ کسی سے محو گفتگو تھے۔ ہم دونوں چپکے سے ایک بچہ پر جا کر بیٹھ گئے اُن میں یوں تو کوئی خاص بات نہ تھی، نہ کوئی پیروں والی ادا تھی بس ایک سادہ سی عام سی محفل تھی لیکن اس سادگی میں ایک حسن تھا، ایک قرینہ تھا، ایک سلیقہ تھا جو دل کو موہ لیتا تھا۔ وہ باری باری سب کو بلاتے، آنے والے کو خود ہی معلوم ہو جاتا کیسے بیٹھنا ہے، کیسے اُن سے بات کرنا ہے، ایسے کوئی مروجہ آداب بھی نہیں تھے۔ بس اُن کا محبت بھری نگاہ سے دیکھنا، اُن کی ہلکی سی پیاری مسکراہٹ اُن کا سلام کے جواب کا انداز، اُن کا ہر ایک بات کا سننا اور پھر اس کا جواب دینا یہ سب دل پر نقش ہوتا رہا۔ اچانک نگاہوں کا گزر اُن کی طرف ہوا، سر پر کپڑے کی سفید گول ٹوپی اور اپنی نوعیت کی، ریڈی میڈ نہیں جو اکثر دیکھنے میں آتی ہے، متوازن ریش جس میں سے قدرے سفیدی جھانک رہی تھی، فراخ پیشانی اور تابناک چہرہ، رنگ اُن کا اپنا، ایسا رنگ میرے دیکھنے میں پہلے کبھی نہ آیا تھا۔ دیر تک میں اُنہیں دیکھتا ہی رہا۔ تھوڑی دیر بعد چائے آگئی اور سب نے اپنا اپنا کپ تھام لیا، چائے کے بعد وہ ہم سے مخاطب ہوئے ”جی رحمت صاحب کیسے آنا ہوا؟“ وہ پاس گئے اور مجھے اُن کی خدمت میں پیش کیا۔ میں نے سلام عرض کیا اور بغیر کسی تمہید کے اپنا مدعا بیان کیا۔ جواب ملنے پر یوں محسوس ہوا کہ جیسے سر سے منوں بوجھ اتر گیا ہو۔ اس ملاقات کے بعد جب بھی دل چاہا اُن کی محفل میں جا کر بیٹھ جاتا۔ وہ لوگوں کے ذاتی مسائل سنتے اور درمیان میں کہیں قرآن پاک سے ارشادات ربانی کی تشریح اور سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی سنت مبارکہ اور محبوب ربانی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے محبوبیت کا تذکرہ ایسے انداز میں فرماتے جس کا اولاً کچھ کم اتفاق ہوا تھا۔ ان کا دل نشین لہجہ، الفاظ کا بر محل چناؤ، فقرات کا اچھوتا درو بست اور رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی محبت میں رچی بسی باتیں اس سادہ سی محفل کو آسمان پر پہنچا دیتیں۔ چائے سب کو ملتی اور چاہ سے بھی سبھی سیراب رہتے۔ خوشہ چینی کا یہ سلسلہ جاری رہا اور میں دامن میں کلیاں سمیٹتا رہا۔ قاعدے آداب کی پابندی سے میں نا آشنا تھا کسی سے بات بھی نہ کرنا بس کچھ وقت کے لئے آتا اور چلا جاتا ایک دن میں اُن کی محفل میں حاضری کے لئے پہنچا تو محفل غائب۔ دل کو ایک دھچکا سا لگا، تھوڑی دیر میں پریشانی دور ہو گئی کسی نے کہا کہ

”آپ کو بابا جی کی تلاش ہے نا“ جی ہاں میں نے کہا۔ وہ اب ”وہاں“ چلے گئے ہیں اور میں ریڈیو وی اسٹیشن کے گیٹ کی طرف چلا گیا۔ غور سے دیکھا تو نظر آیا بابا جی لب سڑک منڈیر کے سائے میں چند لوگوں کے جھرمٹ میں بیٹھے ہیں اور محفل جاری ہے۔ عجب سماں تھا۔ سڑک پر بے تحاشا ٹریفک، ارد گرد شور، دیوار کے سائے کے سوا کوئی اور سایہ نہ تھا، نہ کرسی نہ میز۔ نہ بیچ۔ بابا جی زمین پر بیٹھے ہیں اور ان کے ارد گرد لوگ ہمہ تن گوش۔ میں بھی جا کر بیٹھ گیا۔ پہلے کچھ عجیب سا لگا پھر معمول بن گیا۔ اب محفل کا یہ انداز تھا۔ ان دنوں گرمیوں کا زور تھا۔ پھر برسات آئی۔ ایک روز اتنی بارش ہوئی کہ پانی میں ڈوب گئے لیکن بابا جی نے محفل نہیں چھوڑی۔ کوئی ہلاکت نہیں۔ محفل میں بوڑھے بھی ہوتے، جوان بھی، قوی بھی ہوتے، ضعیف بھی، گرمیاں گزریں پھر جاڑے کی شدت بھی آئی۔ محفل اسی طرح معمول کے مطابق جاری رہی۔ یہ انداز وابستگی بھی دیکھا۔ ایک دن بابا جی محفل کے درمیان میں سے اٹھ کر کہیں یہ کہہ کر گئے ”آپ یہیں تشریف رکھئے گا میں ابھی آیا“ بعد میں معلوم ہوا کہ کسی پروگرام کی ریکارڈنگ کے سلسلے میں بابا جی ریڈیو اسٹیشن تشریف لے گئے تھے۔ اب میں نے بابا جی کے متعلق تھوڑا استفسار کیا معلوم ہوا کہ آپ فری لانس جرنلسٹ بھی ہیں اور آج کل ریڈیو کے لئے سکرپٹ لکھتے ہیں۔ نام گرامی سید محمد وجیہ السیما عرفانی ہے، میں نے یہ نام پہلی دفعہ سنا۔ اس سے ملتے جلتے نام سن رکھے تھے لیکن اس نام کا کوئی آدمی میری نظر سے نہیں گزرا۔ بابا جی کی جس طرح دلکش شخصیت تھی نام بھی ان کا مجھ کو بہت پسند آیا۔ لوگ آپ کو بابا جی، بابا حضور کہتے اور محفل میں اکثر سرکار کہہ کر بھی پکارتے۔ مجھے ان کے نام کا آخری حصہ عرفانی بہت پسند آیا۔ ان کا تخلص بھی یہی تھا۔ میں جب بھی ان کا ذکر کرتا انہیں اس نام سے پکارنے لگا۔ وقت کے سائے ڈھلتے رہے۔ ایک روز میں لب سڑک زیر سایہ دیوار پہنچا تو محفل پھر غائب۔ لیکن جلد معلوم ہو گیا، اب ہیڈ کوارٹر سڑک کے اُس پار شملہ پہاڑی پر شفٹ ہو گئی ہے۔ پیاسا وہاں پہنچ گیا، اب محفل کے سیشن یہاں ہونے لگے۔ کئی لوگ تھری پیس میں ہوتے، کوئی دھوتی میں ملبوس اور کوئی شلوار قمیض پہنے ہوتا، کسی نے لنگی باندھی ہوئی ہوتی اور کوئی من چلا جینز میں فٹ۔ غرضیکہ سبھی قسم کے لوگ ہوتے۔ وہ بلا تکلف مٹی یا گھاس پر بیٹھے دامن پھولوں سے بھرتے رہتے اور اٹھتے وقت کپڑے جھاڑ لیتے۔ میں بھی ایسے ہی کرتا اور اکثر کوٹ پتلون میں ہوتا، ڈرائی کلین کی بھی ضرورت محسوس نہ ہوتی۔ دلوں کے ساتھ کپڑوں کی ڈرائی کلیننگ بھی وہیں ہو جاتی۔ وقت تھوڑا اور آگے بڑھا۔ اب مجھ پر محفل کے ”عام پن“ کے ساتھ ساتھ ”عجیب پن“ بھی سامنے آنے لگا۔ یہ درویش کا دوسرا رخ تھا۔ ایک دن عرفانی صاحب کہنے لگے ”اب محفل کی صفائی ہوگی، بڑے بڑے ستون گرنے والے ہیں“ اور واقعی دیکھا کچھ دنوں بعد چند لوگ جنہیں میں ”مزاج شناس“ سمجھ بیٹھا تھا اور جو اکثر یا ہو کرتے رہتے تھے اچانک محفل سے غائب ہو گئے۔ ایک دن میں محفل میں حاضر تھا کہ ایک بزرگ تشریف لائے۔ سر پر سفید کپڑے کی کلف لگی ہوئی ٹوپی، ایسی داڑھی، تراشیدہ لب، شیروانی زیب تن۔ تھوڑی دیر میں ان کی جلی ہوئی۔ عرفانی صاحب نے حسب عادت پوچھا ”حضرت ہمارے لئے کیا حکم ہے؟“ بڑی جاذب اور موثر شخصیت نظر آرہی تھی ان کی۔ میں نے سوچا بابا جی پیار تو سبھی کو کرتے ہیں انہیں تو خاص طور پر گلے لگائیں گے لیکن جب جواب میں وہ یوں کہنے لگے ”جی زیارت کے لئے حاضر ہوا ہوں“ ”وہ تو خیر چھوڑیے آپ بتائیں ہمارے لئے کیا کام ہے؟“ جی ویسے تو عالم الغیب خدا کی ذات ہے مگر۔۔۔“ بس وہ یہاں تک پہنچے ہی تھے کہ بابا جی جلال میں آگئے ”مولانا غیب کس کو کہتے ہیں؟“ انہوں نے ڈائریکٹ جواب دینے سے احتراز کیا اور کچھ محبت

پیش کرنے کی جسارت کی جس پر جو ان کی طبیعت صاف ہوئی کہ انہیں وہاں سے بھاگنے کو غنیمت سمجھا۔ عرفانی صاحب نے اس طرف ذرا بھی توجہ نہ کی، بس اتنا کہا کہ پتہ نہیں غیب کو لوگوں نے کیا ہوا بنا کے رکھ دیا ہے کہ اس کے بعد مسئلہ غیب کی تشریح ایسے دلکش انداز میں فرمائی کہ دل میں اتر گئی۔ اصل میں دل والوں کی نظر کہیں اور ہوتی ہے وہ بات کی تہہ تک پہنچ جاتے ہیں۔ وہ مولانا جس نیت سے آئے تھے ان کے ساتھ ایسا سلوک ہوا وہ علم بگاڑنے آئے تھے انہیں کیا معلوم تھا کہ علم کے پہاڑ کے سامنے ان کی حیثیت کیا ہے؟ چند روز بعد ایک اور منظر سامنے آیا۔ ایک سادہ سا آدمی ابھی آ کے بیٹھا بھی نہ تھا کہ عرفانی صاحب بھڑک اٹھے ”جاؤ جاؤ یہاں سے چلے جاؤ ابھی اسی وقت“ اُس نے ایک لمحہ کے وقفہ کے بغیر شملہ پہاڑی سے نیچے کی جانب دوڑ لگا دی۔ بے چارے نے پیچھے مڑ کر بھی نہ دیکھا۔ عرفانی صاحب خاموش رہے۔ محفل پر سناٹا چھایا ہوا تھا۔ کچھ لمحوں بعد وہ خود ہی مسکرائے اور یوں کہنے لگے ”جائے جاتے جاتے نعمت لے گیا، ایک ہی جست میں قصہ تمام“ وہ پھر کبھی محفل میں نہ آیا۔ مجھ پر بلاچون و چرا فرمانبرداری کا مفہوم واضح ہو چکا تھا۔ اب میں ذرا ڈرنے لگا تھا لیکن دل میں اطمینان ضرور تھا کہ جو جس نیت سے آتا ہے اس کے ساتھ ویسا ہی سلوک ہوتا ہے۔ ان کی باتیں بڑی پیاری ہوتیں۔ ادھر ذوق و شوق بڑھتا گیا، ادھر محبت کی شیرینی میں اضافہ ہوتا رہا۔ ایک دن کی بات ہے میں محفل میں بیٹھا تھا کہ مجھے بھوک سخت ستانے لگی۔ عام طور پر میں مٹھائی شوق سے نہیں کھاتا اور اگر کھاؤں بھی تو بہت کم، لیکن آج دل چاہ رہا تھا کہ مٹھائی ہو تو خوب کھاؤں۔ ابھی تھوڑی دیر گزری تھی کہ ایک صاحب بمع ایک عدد ٹوکڑہ مٹھائی وارد ہوئے۔ باباجی نے ساری محفل کو خوب مٹھائی کھلائی۔ عرفانی صاحب کے متعلق مشہور تھا کہ وہ پنجگانہ نماز کی بابت بہت سخت ہیں، یہ ان کا معمول تھا۔ خاص طور پر نو واردان محفل میں آنے سے چند روز پہلے نماز شروع کر دیتے اور جب ان سے کہا جاتا ”آپ نماز پڑھا کریں“ تو وہ جواب دیتے ”جی میں تو نماز پڑھتا ہوں“ ”اچھا کل عصر کی نماز کہاں اور کب پڑھی تھی؟“ ”سوری وہ تو مجھ سے مس ہو گئی“ نو وارد شرمندہ ہو جاتا اور آئندہ کے لئے محتاط ہو جاتا اور اگر کوئی تیس مار خان یا ڈھٹائی کا مظاہرہ کرتا تو اس کی خوب صفائی ہوتی۔ کبھی معمول کے خلاف واقعہ پیش آتا۔ ایک موقع پر میلی کچیلی دھوتی اور بنیان پہنے ہوئے ایک شخص آ یا بظاہر ادب و آداب سے بھی وہ عاری دکھائی دیتا تھا۔ اندرون اس کا معلوم نہیں۔ عرفانی صاحب اس کے ساتھ بڑے پیار کے ساتھ پیش آئے۔ نماز کی بھی کوئی پوچھ گچھ نہیں ہوئی۔ نہ آئندہ کے لئے کوئی تلقین۔ بس اتنا فرمایا دکان کھولنے کے بعد ذرا کسی بلند جگہ پر کسی ڈبہ یا برتن میں پانی رکھ دینا اور پھر کام شروع کر دینا۔ ”جی سرکار! ایسا ہی کروں گا“ ”جاؤ موج کرو“ وہ ہنستا مسکراتا خوش خوش چل دیا۔ عرفانی صاحب کا انداز کچھ اپنا ہی انداز تھا اور بعض باتیں میری سمجھ سے بالاتر تھیں بعض دفعہ وہ کہتے ”اب کے حکم ہوا ہے“ میں سوچتا کہاں سے حکم ہوا ہے؟ کیوں ہوا ہے؟ مجھول صیغہ کم از کم میری سمجھ میں نہ آتا تھا۔ ہاں! جب عرفانی صاحب قرآنی آیات کا ترجمہ فرماتے اور تفسیر میں جاتے تو دماغ روشن ہو جاتا۔ ہوش کے دروازے کھل جاتے، اسرار و رموز کے گوہر ہاتھ لگتے اور دل انوار رحمت سے منور ہو جاتا۔ خاص طور پر جب کائنات کے راج دلارے، رحمت تمام اللہ کے حبیب پاک صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ذکر شروع ہوتا تو طبیعت جھوم جھوم اٹھتی اور دل رقص کرنے لگتا۔ عرفانی صاحب کا علم بحرِ خاثر کی طرح ٹھاٹھیں مارنے لگتا۔ الفاظ ان کے سامنے ہاتھ باندھ کر یوں کہتے ”حضور! ہم حاضر ہیں اور ہمیں استعمال کیجئے“ القابات کی فیکٹری میں دھڑا دھڑنت نئے ڈھلنے لگتے، نئے نئے الفاظ جدید بندشیں روانی اختیار کرنے لگتیں۔ عرفانی

صاحب کے بیان کی روانی سے یوں محسوس ہوتا جیسے کاغان میں دریائے کنہار بہہ رہا ہو۔ معانی و مفہوم ذہنوں کی فضا میں ٹیک آف کرتے اور الفاظ کو پیچھے چھوڑتے جاتے۔ مقامات قرآن اور حوالہ جات حدیث بیک وقت ان کی نظر میں ہوتے۔ سیرت طیبہ کا ہر روشن باب خود بخود دکھلتا چلا جاتا۔ اُن کی گفتگو سن کر سمجھ میں آتا کہ جگر نے یہ کیوں کہا تھا ”فیضان الہی عام سہی، عرفان الہی عام نہیں“

دن مہینوں میں بدلتے رہے، مہینے سالوں میں ڈھلتے گئے، شملہ پہاڑی پر محفل جاری تھی۔ جب ذرا غنجہء شوق کھلنے لگتا خوشہ چینی کے لئے سید عرفانی صاحب کے پاس پہنچ جاتا۔ ملاقات کے بعد ایک طمانیت سی محسوس ہوتی۔ محفل کا رنگ ایک ہی تھا، ہاں انداز بدلتے رہتے ہر دفعہ کوئی نئی بات ہو جاتی۔ ایک دن حسب عادت چپکے سے حاضرین محفل کے پیچھے جا کر بیٹھ گیا۔ ایک نوجوان سے مخاطب تھے۔ ”باباجی کوئی پیر پھڑنا چاہیدا اے“ نوجوان کہہ رہا تھا۔ ”ہاں ضرور، لیکن اگر وہ کہے کہ میرے جوتے پالش کرو تو کرو گے؟“ ادھر سے مزید استفسار ہوا۔ نوجوان نے نہایت عجلت سے جواب دیا ”جی سرکار! ضرور کروں گا“ پھر ایسے تو بہت سے مل جائیں گے“ ارشاد ہوا۔ نوجوان اس پر بوکھلا سا گیا۔ اسے کوئی جواب نہ بن پڑا۔ اگر وہ نفی میں جواب دیتا تب بھی مشکل اور اب۔۔ نہ جانے عائدن نہائے رفتن“ کچھ دیر خاموشی رہی، یکدم عرفانی صاحب کی محکم آمیز آواز سنائی دی ”حافظ صاحب! شفیق استاد کا ہاتھ پیچھے ہو اور آپ اس طرح بھٹکتے پھریں“ نوجوان نے پیچھے مڑ کر دیکھا ”نہ مجھے پتہ کہ مرکز توجہ کون ہے نہ اسے معلوم کہ پیچھے میں براجمان“ سارا معاملہ میری سمجھ میں آچکا تھا۔ یہ نوجوان حافظ سعید تھے۔ اسلامیہ کالج سول لائنز میں وہ میرے طالب علم رہ چکے تھے۔ میرے بہت قریب تھے۔ میں انہیں اچھی طرح جانتا تھا۔ انہیں پیروں فقیروں اور مجذوبوں کے پاس جانے کا بڑا شوق تھا۔ وہ مجھے اکثر وہاں کے احوال سنایا کرتے تھے۔ آج اگر اس درویش کے پاس ہیں تو کل کسی مجذوب کو چائے پلا رہے ہیں لیکن ان کی طبیعت کہیں بھی جی نہیں۔ مجھے یاد نہیں کہ عرفانی صاحب کا پتہ انہیں میں نے سمجھایا یا کسی اور کی وساطت سے اس در فیض پر پہنچے۔ یوں تو پہلی ہی ملاقات میں وہ باباجی کی زلف کے اسیر ہو گئے تھے لیکن مکمل خود سپردگی کو آگے بہانے ٹال رہے تھے، آج ان کو محفل میں دیکھا اور اس حال میں دیکھا۔ وہ اپنے آپ کو بابا سرکار کی جھولی میں ڈال رہے تھے وہ اس کان نمک میں جا کر ایسے نمک ہوئے اور بابا سرکار کا رنگ اُن پر ایسے چڑھا کہ بہت سوں کو پیچھے چھوڑ گئے۔ آپ مجھے بڑے حافظ جی جواب اللہ کو پیارے ہو چکے ہیں جن کا ذکر میں پہلے بھی کر چکا ہوں اور وہ فقرہ یاد آ رہا تھا جو وہ اکثر دہرایا کرتے تھے۔ ”فقیر کے جال میں جو پھنسا سو پھنسا“ میری عادت تھی کہ محفل میں چپ چاپ آتا اور چلا جاتا۔ اس واقعہ کے بعد میں محفل میں وہ پہلا سا اجنبی نہیں رہا۔ کچھ دوستوں سے علیک سلیک ہونے لگی۔ کچھ پابندیوں کا ذکر میں نے سنا جن سے اب تک میں روشناس نہ تھا۔ مثلاً محفل میں حاضری کے لئے پابندی ہے کہ صبح ساڑھے آٹھ بجے پہنچ جائیں اور دوم کسی اللہ کے دوست کے ہاں حاضری دینا ہو تو اجازت سے جاتے ہیں یا حکم سے وغیرہ وغیرہ۔ اس کے بعد جب بھی محفل میں آنا ہوتا تو کوشش کرتا کہ وقت پر پہنچوں لیکن پھر بھی کوتاہی ہو جاتی۔ ایک اور عجیب بات یہ تھی کہ کبھی کبھی کچھ ساتھیوں کو جھر جھری آنے لگتی جیسے بجلی کا کرنٹ جسم میں سرایت کر جائے۔ کبھی کوئی دوست ”یا۔ ہو“ کے نعرے لگانے لگتا۔ حافظ سعید اکثر باباجی کا نعرہ لگانے لگتے۔ یہ غالباً انہی کی ایجاد ہے۔ میں نے بچپن میں ایسی کیفیت والد گرامی (اللہ کریم انہیں غریق رحمت کرے آمین) پر طاری ہوتے دیکھی تھی لیکن اس وقت ان باتوں کا صحیح ادراک نہ تھا۔ میرا محفل میں آنا خالصتاً میرا اپنا معاملہ تھا۔ قلبی

کیفیات میری اپنی ذات تک محدود تھیں۔ جذب و مستی کا حال بھلا کوئی کس سے کہے اور کیسے کہے؟ اسی لئے کسی اور سے محفل کا چنداں ذکر نہ کرنا لیکن ان دنوں ”جرمن کلاس“ کے ایک ساتھی اور جن سے گورنمنٹ کالج کے زمانہ کی شناسائی تھی اور جن سے خاندانی روابط بھی تھے اور کچھ ایسے گھل مل گئے کہ اکثر شاہیں اکٹھی ہوتیں۔ کچھ میری سنتے کچھ اپنی سناتے۔ محسوس ہوا کہ وہ بھی کسی چشمہ حیات سے سیراب ہونے کے متمنی ہیں۔ ان سے اشاراتاً کئی بار محفل کا تذکرہ کیا لیکن وہ ادھر راغب نہ ہوتے۔ صریحاً ذکر سے میں نے بھی احتراز کیا۔ وہ اعلیٰ تعلیم یافتہ تھے اور سول سروس میں تھے۔ سوچا طلب ہوئی تو خود ہی سمجھ جائیں گے۔ ابھی کچھ مدت گزری ہوگی ایک دن میں ان کو بڑا مضطرب اور بے چین پایا۔ میں نے ان کی شخصیت کو جھروکے میں سے جھانک کے دیکھا انہیں چند گھمبیر ذاتی مسائل درپیش تھے۔ آج خود ہی بے ساختہ کہنے لگے ”آئیے وہاں چلتے ہیں“ چند لمحوں کے بعد ہم شملہ پہاڑی محفل میں حاضر تھے اور جو مسائل میرے دوست کو درپیش تھے ان میں سے ایک کا بیان ہو رہا تھا۔ من کی دنیا کے عجائبات یونہی اٹھنے لگتے ہیں۔ عرفانی صاحب اکثر فرمایا کرتے کہ شیخ بدرالدین اسحاق (نور اللہ مرقد) جب بابا حضور قدس اللہ تعالیٰ سرہ العزیز کے ہاں پاک پتن شریف میں پہلی دفعہ حاضر ہوئے تو اس وقت ان کی بھی یہی کیفیت ہوتی تھی۔ وہ شیخ زمانہ تھے۔ ولی جیسے علم و فضل کے مرکز، فتاویٰ کی مسند پر بیٹھے تھے۔ وہ مسائل ایسے درپیش ہوتے کہ ان کا حل ڈھونڈنے کے لئے اس دور کی ولاستوں کا سفر اختیار کیا۔ راستے میں ملتان پڑا کسی نے کہا کہ یہاں قریب ہی ایک بابا فرید الدین مسعود ہیں وہاں سے ہوتے چلئے۔ شاید آپ کے مسائل حل ہو جائیں۔ انہیں گمان گزرا کہ میں شہر سے آیا ہوں۔ بھلا ایک معمولی سی جگہ پر میری کہاں تشفی ہوگی۔ کرنا ایسا ہوا کہ قافلہ کو اسی مقام پر کئی روز رکنا پڑا۔ سوچنے لگے چلو دیکھتے ہیں کون سے بابا ہیں؟ اب پاک پتن شریف پہنچے بابا حضور کی محفل جاری تھی اور انہیں دو مسائل میں سے ایک مسئلہ بیان ہو رہا تھا۔ شیخ بدرالدین اسحاق بابا حضور کے قدموں میں گر گئے، بابا حضور نے انہیں سینے سے لگایا اور نعمت سے سرفراز فرمایا۔ اس کے بعد انہیں نہ تو سفر یاد رہا نہ کبھی جانے کا خیال آیا۔ وہ بابا جی کے ایسے ہوئے کہ زندگی بھی ان کی معیت میں گزار دیں اور لحد بھی وہیں نصیب ہوئی۔ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ عرفانی صاحب میری روح میں سرایت کرتے گئے۔ میرا اُن سے تعلق کچھ ایسا تھا جو الفاظ پر محیط نہیں۔ اُن کا فیض عام بھی تھا اور مخصوص بھی۔ اُن کی محفل ہر ایک کے لئے تھی۔ سبھی قسم کے لوگ آتے، ہر ایک سمجھتا عرفانی صاحب میرے ہیں۔ وہ ان کے ذاتی مسائل بھی سنتے۔ مسائل کے حل کی نشاندہی بھی کرتے اور علم کے موتی بھی لٹاتے۔ حتیٰ کہ جو دوست دنیا سے رخصت ہو جاتا یا محفل سے رخصت ہو جاتا تو اس کا ذکر عرفانی صاحب اکثر بڑے محبت و پیار کے ساتھ فرماتے۔ اُن کی محفل کیا تھی یوں کہئے کہ کیا نہیں تھی۔ یہ علوم کی دنیا کی سیر بھی تھی۔ یہ عمل کی فضا میں گہرا سانس بھی تھا۔ یہ درس و تدریس کی محفل بھی تھی یہ عشق و مستی کی نگاہ بھی تھی۔ عرفانی صاحب کی شخصیت کا جس گوشہ سے نظارہ کیا وہ کمال تھا۔ قرآن نہی کوئی اُن سے سیکھے۔ مقام رسالت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر بولتے تو پھول جھڑنے لگتے۔ سائنس کی دنیا ہو یا شعر کی فضا۔ خطابت ہو یا صحافت ذوق جمالیات کا ذکر ہو یا احساس تناسب کی بات۔ حالات حاضرہ ہو یا پاکستان کا بیان۔ بس اُن کو سنا کیجئے۔ قائد اعظم اور علامہ اقبال کی بات چل نکلتی تو آپ تھک جائیں گے لیکن اُن کے روایتی بیان میں کسی قسم کی کمی نہ آتی۔ سفر ہو یا حضر، مسکراہٹ، ظرافت اور لطافت کے ساتھ ساتھ چلتی۔ کہیں حکمت و عبادات اور احکامات کا ذکر ہوتا، کہیں لطیفے و چٹکے ہوتے۔ کبھی کبھار جلال کی کڑک بھی سنائی دیتی لیکن کیا مجال جو

ذرا بھی جمال شائستگی کا دامن ہاتھ سے چھوٹ جائے۔ ایک دفعہ ایک صاحب خدمت میں حاضر ہوئے انہوں نے اپنی بات ابھی شروع بھی نہ کی تھی کہ عرفانی صاحب کے چہرے پر ناراضگی کے آثار پیدا ہوئے۔ فرمانے لگے ”پہلے اپنے ساتھ جو خواتین ہیں ان کو گھر چھوڑ کے آؤ پھر آنا“ وہ کچھ دور کہیں گاڑی کھڑی کر کے آئے تھے اور گاڑی میں خواتین سوار تھیں۔ نہ جانے عرفانی صاحب کو کیسے معلوم ہو گیا کہ ان کے ساتھ خواتین ہیں۔ آپ خواتین سے قطعاً نہ ملتے تھے۔ حتیٰ کہ خواتین کی بات بھی صرف اُن کے ”محرم“ کے ذریعے ہی سنتے۔ اُن کے لئے ”محرم اور“ نامحرم“ کے درمیان والی دیوار بڑی مضبوط تھی۔ وہ خود بھی اس پر سختی سے پابند تھے اور دوسروں کو بھی یہی تعلیم دیا کرتے تھے۔ اسی طرح اُن کے نزدیک محافل میں نابالغ بچوں کا داخلہ بھی منع تھا۔ عرفانی صاحب کا ایک اور مخصوص انداز تھا اور وہ کسی سے مصافحہ نہ کرتے تھے۔ شروع شروع میں اُن کی اس عادت پر مجھے تعجب ہوا لیکن بعد میں جب آپ نے مصافحہ نہ کرنا ترک کیا تو اس میں اندھی تقلید دیکھنے میں آئی جس سے مصافحہ نہ کرنے کی حکمت واضح ہو گئی۔ میرے خیال میں والہانہ عقیدت اور اندھی تقلید میں ایک واضح فرق موجود ہے۔ عرفانی صاحب میں پیروں والی کوئی بات نہ تھی وہ محفل لیتے تھے لیکن بیعت نہ لیتے۔ بس اُن سے وابستگی ہی بیعت تھی۔ ایک اور حیران کن بات یہ تھی کہ وہ سگریٹ پیتے تھے اور کش لگاتے جاتے۔ ہاں جب کلمات تقدس کا بیان ہوتا تو سگریٹ بجھا دیتے یا پرے پھینک دیتے۔ عرفانی صاحب کی خدمت میں حاضر ہونے سے پیشتر مجھے ایک بزرگ سے جمال ہم نشینی تھا وہ بھی بہت سگریٹ پیتے تھے لیکن برملا اس کا اظہار کرتے تھے کہ یہ میرا عیب ہے۔ عرفانی صاحب نے اس بارے میں کبھی کچھ نہیں کہا۔ نہ ہی کسی کو کبھی ہمت ہوئی کہ اُن سے اس بارے میں پوچھے۔ سچ تو یہ ہے کہ اُن کے چہرے پر وجاہت کچھ یوں سجی ہوئی تھی کہ اسے ایک پر نور وقار کہنا چاہئے۔ اس میں رعب اور دبدبہ بھی تھا لیکن محبت و شفقت کا لمس بھی نمایاں تھا اس میں جلال بھی تھا۔ جمال بھی تھا لیکن جمال غالباً اُن کے چہرے پر زیادہ تھا جس پر نگاہ زیادہ دیر تک نہ ٹھہرتی تھی۔ حاضرین نگاہیں نیچے کئے رہتے۔ بس اُن کے الفاظ دل میں اترتے جاتے وہ جس موضوع کو پکڑتے اُسے خوب کھنگالتے اور کسی لحاظ سے تشنہ نہ چھوڑتے۔ اُن کے بیان میں علمیت ہی نہ ہوتی حقیقت بھی ہوتی۔ واقعات کے ساتھ واردات بھی ہوتی۔ شریعت اور طریقت ساتھ ساتھ چلتے۔ وہ جو بیان کرتے قرآن مجید کے دائرہ کے اندر رہ کر کرتے۔ وہ جب قرآن پاک کو کتاب کائنات کے نام سے پکارتے اور ثابت کرتے کہ یہ واقعی کتاب کائنات ہے تو اُن کے منہ سے شہد ٹپکنے لگتا۔

